تذکرہ

ملکۂ حیات بخشی بیگمؒ

مرتبہ

ابو محمد مصلح

شائع کردہ

ادارۂ عالمگیر تحریک قرآن مجید حیدرآباد دکن

محرم ۱۳۶۵ ہجری

تعارف

ملکۂ حیات بخشی بیگمؒ کی یہ مختصر سوانح دو غرض سے پیش کیجا رہی ہے۔ ایک تو اس لئے کہ وہ اس لائق ہے کہ پیش کی جائے تاکہ ہماری خواتین اس سے اچھا سبق لیں اور دوسری غرض ان کی " شاہکار یادگار" مدرسہ کی عمارت (جس میں اب " جامعہ قرآنیہ" قائم ہے) اور " مسجد شاہی " حیات نگر۔ عام طور پر منظر عام پہ آجائیں۔ اور یہ سبب بنے اس امر کا کہ ان دونوں چیزوں کی تب خواہ مرمت ہوجائے اور ضمانت ہو جائے اس بات کی کہ اب حوادثاتِ زمانہ کی شکار نہ ہوں گی۔ اِنَّ اللہَ علےٰ کُلِّ شَئٍ "

ابو محمد مصلح
جامعۂ قرآنیہ حیات نگر
حیدرآباد دکن

۱۲- ذی الحجہ
سنہ ۱۳۶۴ ہجری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ حیات بخشی بیگمؒ

نام

حیات بخشی بیگم

عرف

ماں صاحب

دکن میں ماں صاحب مادرِ سلطان کو کہتے ہیں۔ یہ دکن کی شاہی اصطلاح ہے۔ جس طرح مغلوں سے پہلے دہلی کے بادشاہوں کی والدہ "مخدومۂ جہاں" کہلاتی تھیں اور مغلوں کے آخرِ زمانہ میں محمد شاہ بادشاہ غازیؒ

کے بعد سے بادشاہ کی والدہ قدسیہ بیگم کہلاتی تھیں اور عالمگیر ثانی کے بعد "جناب عالیہ" حیات بخشی بیگم سلطان عبداللہ قطب شاہ کی ماں تھیں اس لئے عرف عام میں ماں صاحب مشہور ہوئیں۔

خاندان

حیات بخشی بیگم سلطان محمد قلی قطب شاہ کی بیٹی، سلطان محمد قطب شاہ کی بیوی اور عبداللہ قطب شاہ کی ماں ہیں۔ والدہ کا نام بھاگ متی عرف حیدر محل ہے جس کے نام پر شہر حیدرآباد بسایا گیا۔

ولادت

حیات بخشی بیگم کی ولادت سنہ ۱۰۰۱ھ میں ہوئی چونکہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی اس لئے

سلطنت اور خاندان کی واحد چشم و چراغ حیات بخشی بیگم تھیں۔

تعلیم و تربیت

سلطان محمد قلی قطب شاہ کا دورِ سلطنت سلاطینِ قطب شاہیہ میں اپنے قسم کے عروج کا زمانہ ہے۔ اہلِ علم اور اہلِ فن کا مجمع تھا اور پھر حیات بخشی بیگم اکلوتی دختر تھیں اس نے ہر قسم کی شاہانہ تعلیم و تربیت میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی گئی۔ جس کا ثبوت ان کے وہ کارنامے ہیں جو دکن کے لئے طرۂ امتیاز ہیں۔

شادی

حیات بخشی بیگم ابھی سنِ بلوغ کو نہیں پہنچی تھیں کہ شاہِ ایران کی طرف سے ایک خاص ایلچی کے ذریعہ شادی کا پیام آیا۔

یقیناً اس شادی کے پیام کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔
اور اس کے کئی سبب ہیں لیکن بڑا سبب خود حیات بخشی بیگم
کا حسن و جمال اور اس کے ساتھ حسنِ سیرت وغیرہ بھی ہے۔

اس وقت ایران کا حکمران شاہ عبّاس صفوی تھا جس نے
اپنے بیٹے کے لئے خواستگاری کی تھی۔ لیکن کسی وجہ سے یہ
پیام قبول نہیں کیا گیا۔ بلکہ قرعۂ فال شہزادہ محمدؐ کے نام پڑا۔
جو حیات بخشی بیگم کا چچیرا بھائی تھا اور جس کی تعلیم و تربیت خاص
طور پر ہوئی تھی اور غالباً اسی دن کے لئے ہوی تھی۔ یہاں تک
کہ یہی شہزادہ آگے چل کر محمدؐ قطب شاہ کے تخت کا مالک ہوا
شادی کی رسم ۱۰۱۶ھ ماہ ربیع الاول شریف
میں ادا ہوئی۔ اس نسبت میں میر مومن کا سیاسی ہاتھ کارفرما تھا۔

ظاہر ہے کہ ان میں کتنی غیر شرعی رسم و رواج برتے گئے ہوں گے۔ پھر محمد قلی قطب شاہ جیسے فراغ دل اور عیش پرست بادشاہ کے بھتیجے اور اکلوتی بیٹی کی شادی تھی اس لئے کچھ نہ ہوا ہو کم ہے۔ میر محمد مومن سبزواری کا قطعہ ملاحظہ ہو۔

قطعہ

دوش سرکردہ خیالم رہ بزمے چو بہشت
زاں آں بزم چو حوراں ہمہ نورانی چہر
بزم عیشی کہ ملائک بہ تماشہ شدہ چشم
سر بروں کردہ چو انجم ہمہ از جیب سپہر
گفتم این بزم کہ و عیش چہ تاریخش چیست

کہ زافلاک برایام ہمی بارد مہر

عقل کو بود چو من مست مئے حیرت گفت

عیسیٰ مولود وبزم شہہ وعقدِ مہہ ومہر

چار بیتی بکن این قطعہ معین می شاید

در چنیں نظم ترا بر گذر و قافیہ سحر

حیات بخشی بیگم کا شوہر

حیات بخشی بیگم کے باپ محمدؐ قلی قطب شاہ کی وفات کے بعد محمدؐ قطب شاہ حیات بخشی بیگم کا شوہر سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس بادشاہ کا عہدِ حکمرانی صاف طور پر نظر آتا ہے کہ محمدؐ قلی قطب شاہ کے عہد سے مختلف ہے نہ تو وہ عیش پرستی ہے نہ وہ رنگ رلیاں ہیں۔ برخلاف

اس کے ایک قسم کا زاہدانہ رنگ ہے۔ اس کا سبب سے حیات بخشی بیگم کا علم و فضل اور پاکبازانہ افتاد طبیعت کا اثر سمجھا جانے محمد قطب شاہ اپنی چہیتی بیگم کے مشوروں کو سر آنکھوں پر رکھتا تھا اور یہ صرف اوس کی صفت نہیں بلکہ حیات بخشی بیگم کی خوبیاں بھی ہیں جو اوس کو ایسا کرنے پر مجبور کرتی تھیں چنانچہ بیگم ہی کے مشورے سے قلعہ گولکنڈہ کے جواب میں۔ مچھلی پٹم کے راستے پر حیات نگر اور سرونگر کے درمیان ایک عالیشان قلعہ تعمیر کرا رہا تھا۔

جس کے آثار اب تک ایک طویل طویل رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں

بیجاپور سے ہوا۔

عبداللہ قطب شاہ پہلا لڑکا تھا۔ جو وارثِ تخت و تاج ہونے والا تھا۔ اس لئے چاہئے تو یہ تھا کہ اس کے پیدا ہونے پر دل کھول کر جشن منائے جاتے اور دھوم دھام سے رسمیں ادا کی جائیں مگر حیات بخشی بیگم کے علم وفضل نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ میر مومن نے "کامِ بخش حیا نہا" سے اس کی تاریخِ ولادت نکالی ہے۔

حیات بخشی بیگم بحیثیت ماں

راج پاٹ کے لئے جو ریشہ دوانیاں کی جاتی ہیں اور جس طرح کی سازشوں کا بازار گرم ہوتا ہے اس سے کون واقف نہیں۔ مارنے کی ترکیبیں اور مرنے کے سے نے عائیں عام ہوئیں

کتنے حکمران ماں اور باپ ہیں جو اپنی اولاد کے حق میں بطیب خاطر تخت و تاج سے دست بردار ہو جاتے ہیں لیکن ایک حیات بخشی بیگم ہیں کہ صرف بارہ برس کی عمر میں اپنے بیٹے کو اپنے سامنے حکمران دیکھنا پسند کرتی ہیں۔ تاکہ ان کی زندگی ہی میں وہ ایسا راعی بن سکے جو رعایا کے حسبِ حال ہو۔

دورِ جدید کی مہذّب اور ترقی یافتہ حکومتیں بھی اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی تھیں جو اس نامور ماں نے کیا یعنی عبداللہ شاہ کو حکمرانی سپرد کر کے مدبّرین کی ایک کونسل ترتیب دیدی جس کی نگرانی اس نے خود اپنے ذمّہ لی۔

ایک مشہور واقعہ

حیدرآباد میں لنگر کی یاد اب تک باقی ہے کہتے ہیں کہ

اس کا تعلق ایک مشہور واقعہ سے ہے یعنی عبداللہ قطب شاہ
ایک دن ہاتھی پر سوار جارہا تھا کہ ہاتھی آپے سے باہر ہوگیا
اور خودسرانا ایک طرف کو بھاگ نکلا۔ بیٹے کے متعلق یہ خطرناک
خبر جب ماں کو ملی تو ماں تا کی ماری نے "نذر" و "منت"
کو بھی حصولِ مقصد کا ذریعہ بنایا۔ اسی سلسلے میں یہ بھی کہتے
ہیں کہ ہاتھی جس طرف کو بھاگا تھا اوس طرف کے درختوں
میں جابجا پانی کی صراحیاں اور روٹیاں لٹکا دی گئیں تھیں
تاکہ شہزادہ کو جہاں کہیں بھی موقع ملے۔ اس کو استعمال میں
لائے۔ بہرحال یوسفِ گم گشتہ ہاتھ آگیا تو سونے کے "لنگر"
کی شکل میں۔ نذر و منت پوری کی گئی۔ ماں بننا آسان ہے
لیکن ماں کے فرائض ادا کرنا سب کو نہیں آتا۔

حیات بخشی بیگم بحیثیت حکمران

شادی کے چار سال بعد محمدؒ قطب شاہ کا انتقال ہوگیا تو سلطنت کی مالک حیات بخشی بیگم قرار پائیں - اور پندرہ سال تک نہایت کامیاب حکمران کی طرح حکمرانی کرتی رہیں - اور سچ تو یہ ہے کہ رعایا کے لئے صالح دور تھا -

حیات بخشی بیگم کی اولاد

حیات بخشی بیگم کا پہلا لڑکا عبداللہ قطب شاہ ہے جس کی ولادت ۱۰۲۳ھ میں ہوئی - دوسرا لڑکا شہزادہ علی مرزا اس کے دو سال کے بعد تولد ہوا - اور تیسری اولاد خدیجہ سلطانہ شہر بانو ہے جس کی شہرت حاجی بڑے صاحب کے نام سے ہوئی - اور جس کا عقد سلطان محمد عادل شاہ

بیٹی کے ساتھ سلوک

بیٹا تو خیر سے بیٹا ہی ہے۔ خدیجہ سلطانہ بیٹی کی تعلیم وتربیت بھی اس شاہانہ انداز میں کی گئی کہ اوس کے حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ سیرت کی بھی شہرت ہوئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ والی بیجاپور سے شادی ہوئی۔ اس کو بھی مادرانہ شفقت ایک کرشمہ سمجھنا چاہئیے۔

اولاد کی تعلیم وتربیت میں مذہبی رواداری

حیات بخشی بیگم میں اللہ تعالیٰ نے جو اوصاف دیئے تھے اوس میں سے ایک بڑا وصف اولاد کی تعلیم وتربیت میں مذہبی رواداری بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلا استثنا ہر شخص کا دل ان کے احترام کے لئے جھکتا ہے۔ خود اپنے شوہر یہ

جو کچھ اس نیک بی بی نے مذہب کا غیر متعصبانہ رنگ ڈالا تھا۔ وہ تاریخ بین طبقہ سے پوشیدہ نہیں۔ یہی رنگ اولاد کی تعلیم و تربیت میں قائم رہا بلکہ کچھ اس سے بھی بڑھکر۔ عبداللہ قطب شاہ کا گنبد۔ گنبدوں سے باہر دروازہ کے سامنے ہے اس کے متعلق مشہور یہ ہے کہ عبداللہ قطب شاہ نے قریب قریب شیعیت کو ترک کر دیا تھا اور سنیت اختیار کرلی تھی اسی لئے اس کا مزار رواج کے خلاف گنبدوں سے باہر بنایا گیا۔ واللہ اعلم بالصواب

واقعہ خواہ کچھ بھی ہو لیکن دل کہتا ہے کہ حیات بخشی بیگم ایک غیر معمولی طبعیت کی مالکہ تھیں اور ان کا شمار صالحات کے سوا اور کسی میں نہیں ہو سکتا۔ پھر اب کونسی بات مانع

ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو بھی انہیں صفات سے آراستہ

حضرت اورنگزیب عالمگیرؒ اور حیات بخشی بیگمؒ

سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہدِ سلطنت میں شاہجہاں شہنشاہِ دہلی کی طرف سے شہزادہ محی الدین اورنگ زیب صوبہ دار دکن نے بعض وجوہ سے لشکرکشی کی اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کو عاجز کیا۔ نازک گھڑی تھی۔ گولکنڈہ مفتوح ہوا چاہتا تھا کہ حیات بخشی بیگم نے اس کو اپنے حسن تدبر سے سنبھال لیا۔ یعنی حیات بخشی بیگم صلح کرانے کے لئے مردانہ وار خود نکلیں اور مغلیہ کیمپ میں پہونچ گیئں۔ حضرت اورنگزیب عالمگیرؒ کو معلوم ہوا۔ تو چند معززین کو استقبال کے لئے روانہ کیا اور بصد عزت وحرمت شاہی خیمہ تک پہونچایا گیا۔

حیات بخشی بیگم نے اپنے آنے کی غرض بیان کی اور ایسی نہیں،
تھی جو حضرت عالمگیرؒ جیسی شخصیت کا مالک بھی اوس کی پذیرائی
نہ کرے۔ چند شرطیں درمیان میں آئیں اور باہم صلح ہوگئی۔ دو
مسلمان حکمرانوں میں لڑائی اور ہر دو طرف سے مسلمانوں کا خون
بہنا یقیناً کسی طرح سے بھی گوارا کرنے کی چیز نہ تھی اور اس طرح جنگ کے
خاتمہ بخیر ہونے کا سہرا دکن کی اسی نامور خاتون کے سر ہے۔

حیات بخشی بیگم کی وفات

حیات بخشی بیگم کی وفات ۲۰ شعبان ۱۱۰۰ھ میں ہوئی
مزار گولکنڈہ میں مشہور گنبدون (لنگر فیض اللہ) کے احاطہ میں ہے
سلطان محمد قطب شاہ کا گنبد بھی قریب ہے۔ چونکہ قطب شاہیت
کے اس گورستان میں گنبد ہی گنبد ہیں۔ اس لئے عام طور پر یہ نام [illegible]

اس کو گبندوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حیات بخشی بیگم کے مزار پر بھی عالیشان گبند بنا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک عمدہ اور خولصبورت مسجد تعمیر ہوئی ہے۔ سنگ مزار آیات و سورِ قرآنی سے مزین ہے۔

حیات بخشی بیگم کے اخلاق و عادات

بعض دور ایسے ہوتے ہیں جس کی پوری مدت میں کسی ایک ہستی کی خوبیاں چھائی ہوتی ہیں۔ لیکن حیات بخشی بیگم کی ذات ایسے کئی دور پر اثر انداز ہے اور اس کے اسباب اس بزرگ خاتون کے ظاہری اور باطنی اوصاف ہیں۔ خاندانی بڑائی اور اوس سے صحیح تمتع سے خوش قسمت ہی بہرہ ور ہوتے ہیں ورنہ مایۂ منفعت دلِ بیرحم کی مثل صادق آتی ہے۔ اللہ تعالےٰ

اختیارات اور حکمرانی دی تو اوس کا مناسب مشرف لیا۔ علم و فضل دیا تھا۔ اوس کی حقیقی روشنی پہونچائی۔ رعایا کی فلاح و بہبود میں دل کھول کر روپیہ صرف کیا۔ رفاہِ عام کے کام اتنے کئے کہ آج ساڑھے تین سو برس گزرنے پر بھی اس کا فیض جاری ہے۔ سخاوت کے دریا بہادئے۔ رحم دلی کی نہریں جاری کر دیں خدا ترسی کے ستون کھڑے کر دئے۔ بچپن سے سے لیکر ضعیفی کے عالم تک نیکیوں کا یہی عالم رہا۔ جابجا عالیشان مسجدیں بن رہی ہیں۔ مسافر خانے قائم ہو رہے ہیں۔ خانقاہیں آباد ہو رہی ہیں۔ انعام و جاگیریں تقسیم ہو رہی ہیں۔ یتیموں کی پرورش کی جارہی ہے۔ ناکتخدا اور بیوہ عورتوں کی شادیاں کی جارہی ہیں۔ مدرسے قائم کئے جارہے ہیں۔ بزرگوں کی

نمازین ہو رہی ہیں۔ الغرض ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیک کاموں کے انجام دینے کی تلاش ہے اور خلقِ خدا کو آرام دینے اور انکی خدمت انجام دینے کا جذبہ درجۂ حرص تک پہونچا ہوا ہے

حیات بخشی بیگم کی یادگاریں

اس نیک دل خاتون کو اللہ تعالیٰ نے ملک ومال بھی دیا تھا، اور علم ودانش بھی لیکن اس کے ساتھ خدا ترسی اور خلق خدا کے واسطے رفاہِ عامہ کے کاموں کو انجام دینے کے لئے طبیعت ثانیہ بخشی تھی اس لئے تفصیل کے ساتھ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اسے اپنے وقت ہی میں کیا کیا ہوگا۔ دکن میں ہزاروں مسجدیں، خانقاہیں۔ کاروان سرائیں جائدادیں اور تالاب وغیرہ ویران پڑے ہیں۔ اور ان سب کے بانیوں

کو کون جانتا ہے تاریخیں اپنے اندر اتنی پہنائی اور مورّخ اپنے قلب میں اتنی وسعت رکھنے سے قاصر ہیں۔

پھر کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے کتنی چیزیں، خود حیات بخشی بیگم کی بنائی ہوئی ہیں اور کتنی ان کی مدد اور ان کے اثر سے ظہور میں آئی ہیں۔ تاہم ذیل کی خبریں خاص طور پر مشہور رہیں۔

۱۔ حیات نگر

۲۔ خاص باغ حیات نگر

۳۔ جامعۂ مسجد مدرسہ شاہی حیات نگر

۴۔ ماں صاحب کا تالاب (یہ کئی ہیں)

۵۔ مسجد و خانقاہ قطبِ عالمؒ متصل فتح دروازہ

۶۔ مسجد واقع دولت خانہ عالی

۷۔ ماں سائی پیٹھ (مان شاہی)

۸۔ بی بی کا چشمہ

۹۔ بی بی کا الاوہ

۱۰۔ علم لعل صاحب

۱۱۔ حیات ماں کا چلہ

حیات آباد عرف حیات نگر

۱۰۳۵ھ میں حیات بخشی بیگم نے اپنے نام پر "حیات آباد" کو آباد کیا جو اب عرف عام میں حیات نگر کے نام سے مشہور ہے یہ مچھلی پٹم۔ نلگنڈہ روڈ پر۔ بلدہ (چار مینار) سے دس میل کے فاصلہ پر ہے۔ اسی حیات نگر اور سرور نگر کے درمیان ہی

پرانا قلعہ سلطان نگر) ہے جس کو حیات بخشی بیگم کے شوہر محمد قطب شاہ

بنوا رہے تھے۔

اب کا حیات نگر وہ نہیں جس کی تعریف مورخ نظام الدین

صاعدی نے اپنی تاریخ میں کیا ہے اب کا حیات نگر ویرانی

کا مرکز ہے اور تاریخی حیات نگر عبادت گذاروں اور نیکوں

کا مخزن تھا۔ اب کا حیات نگر جہل و تاریکی رکھتا ہے اور

تاریخی حیات نگر علم و ہنر سے مالا مال تھا۔ آپ تاریخ کے ان

فقروں کو پڑھئے اور پھر حیات نگر کو جا کر ایک نظر دیکھ آئے۔

لکھا ہے کہ :۔

حیات آباد ایک ایسا قطعہ ہے جو جنت کا

ٹکڑا معلوم ہوتا ہے یہ دار السلطنت حیدر آباد

کے مشرقی سمت میں دو فرسخ پر واقع ہے
سلطان عبداللہ کے جلوس کے پہلے سال اس
کو آباد کیا گیا۔ اس جگہ خانقاہ یوسف جمال رح
کی ایسی دلنشیں طرح ڈالی گئی ہے جو فردوس قرین ہے
یہاں اہلِ صنعت و حرفت اور دوسرے اشخاص
کی کثرت ہے۔ اور بڑی بڑی عمارتیں اور باغات
ہیں (ترجمہ از فارسی)

ایک مقامی مورخ لکھتے ہیں

حیات ماں کی بہت بڑی یادگار اس کا آباد کیا ہوا حیات آباد
ہے جس سے حیات بخشی بیگم کا صحیح ذوقِ تعمیر و آباد کاری معلوم
ہوتا ہے۔ یہ ۱۰۳۵ھ میں عبداللہ قطب شاہ کی تخت نشینی

کے پہلے سال تعمیر کیا گیا۔ غالباً اس کا مقصد اس تخت نشینی کی یادگار قائم کرنا تھا۔ اور یہ ایک اچھی یادگار ہے، اول تو یہ حیدرآباد کے مشرق میں بہت قریب واقع ہے جہاں شاہی تفریحیں اور تقریبیں ہو سکتی تھیں دوسرے موسوی ہٹم کی شاہ راہ پر آباد کیا گیا تھا۔ جو مسافر مشرقی بندرگاہوں سے اور ملک کے مشرقی اضلاع سے حیدرآباد آتے تھے۔ وہ یہاں ٹھہرتے تھے۔ اور اس طریقے سے یہ شہر سے قریب ایک اچھی منزل تھی۔ حیات آباد میں شاہی قصر بنایا گیا۔ مسافروں کے لئے ایک کارروان سرائے بنائی گئی۔ جو سرائے ماں صاحب کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے کئی دروازے ہیں۔ اس کے احاطہ میں ایک مسجد ہے۔ جو قطب شاہی تعمیر کاری کا اچھا

نمونہ ہے۔ اس کے قریب جو خاص باغ بنایا گیا تھا۔ اب تک موجود ہے۔ اور بچوں کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ تعمیر کیا گیا، اس سے حیات ماں کے عہد کی رونق اور چہل پہل کا اندازہ ہو سکتا ہے (تاریخ گولکنڈہ)۔

خاص باغ

حیات بخشی بیگم نے اپنی رہائش کے لئے حیات نگر کو پسند کیا تھا۔ یہاں ایک قصر تعمیر کیا گیا تھا اور ایک وسیع باغ کی طرح ڈالی تھی۔ جو آج بھی خاص باغ کے نام سے مشہور رہے کئی حوض تھے جن میں پانی بھرا رہتا تھا، فوارے چھوٹتے رہتے تھے۔ دروازے کے سامنے ایک تل محل تھا جس کے آثار اب بھی باقی ہیں۔ اس کے سامنے بھی ایک حوض ہے

تل محل ایک ایسی عمارت تھی جو گرمیوں کے موسم کے لئے خاص

طور پر مناسب تھی۔ ہوائی جہازکی گولہ باری سے بچنے کے لئے آج

جو زمین دوز چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ تل محل اس کے لئے بھی

مناسب و موزوں ہے۔ ایک طرح سے یہ سب چیزیں مدرسہ اور مسجد کی خاطر تھیں

کاررواں سرائے

حیات نگر میں ایک تو میر عالم کی سرائے ہے دوسری

کاررواں سرائے حیات ماں صاحبہ کی تعمیر کردہ تھی۔ یہ مسلسل

کمانیں تھیں جن کا الحاق خانقاہ کی عمارت سے تھا اور

جو مدرسہ و خانقاہ کے باہر واقع ہوئی تھیں۔ دستبرد زمانہ سے

ان کمانوں کے دو حصے برباد ہو گئے اور ان کے پتھر تک

باقی نہ رہے۔ کمانوں کا ایک حصہ جو باقی رہ گیا ہے وہ بھی

افتادِ زمانہ کی وجہ سے زمیں دوز ہوا چاہتا ہے۔ یہاں "جامعۂ قرآنیہ" جب سے قائم ہوا ہے اس طرف خاص توجہ کی گئی ہے کہ بقیہ یادگارین ضایع نہ ہونے پائیں۔ چنانچہ ان کمانوں کو بھی محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاکہ پتھر وغیرہ کو لوگ نہ لے جانے پائیں۔

شاہی عاشور خانہ

اسی کارروان سرائے متصل شاہی عاشور خانہ ہے۔ آج اس کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہے۔ انعام کی باؤلی اور کھیت بھی نااہلیت کی نذر ہو چکا ہے۔

حیات نگر میں جشن شاہانہ

سنہ ۱۰۴۱ھ میں عبداللہ قطب شاہ اپنے عنفوان شباب

کو پہونچے۔ اور کاروبار سلطنت سنبھالنے کے قابل ہوا تو ایک شاہانہ جشن منانے کی تیاری ہوئی۔ اس کا ذمّہ حیات بخشی بیگم نے لیا۔ یہ امر خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ بجائے دار السلطنت حیدرآباد کے اس جشن کے لئے حیات نگر کا انتخاب عمل میں آیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے حیات بخشی بیگم کی حیات نگر سے دلبستگی کا پورا پتہ چلتا ہے۔

حیات آباد دلہن بن گیا۔ چنانچہ اس جشن میں تمام بستی کی آئینہ بندی کی گئی۔ اور ۱۴۔ رجب ۱۰۴۰ھ کو عبد اللہ قطب شاہ دولھا بنا ہوا معہ جلوس سعید آباد پہونچا اس جشن کی یہ پہلی منزل تھی۔ دوسرے روز قصبہ منصور آباد۔ اور تیسرے دن صبح کے وقت حیات نگر میں رونق افروزی ہوئی۔

یہاں عیش وطرب کا بازار گرم ہوا۔ صغیر اور کبیر اور برنا د پیر عیش و عشرت میں مشغول ہوئے۔ اربابِ طرب، شعرا، علما، امرا، ہر قسم کے لوگ جمع تھے۔ سب کو خلعت والغام تقسیم ہوئے۔

شاہجہان شہنشاہ دہلی کے ایلچی شاہ علی بیگ کو دو گھوڑے ایک ہاتھی اور اوس کے بیٹے کو ایک گھوڑا اور خلعت مرحمت ہوئی۔ اور جو ایلچی دربارِ دہلی و ایران وغیرہ میں گئے ہوئے تھے انھیں بھی علی قدر مراتب خلعت وغیرہ سے سرفراز کیا گیا۔

خانقاہ یوسف جمالؒ و مدرسۂ حیات بخش

حضرت سید یوسف جمالؒ کا کسی جگہ ذکر آچکا ہے۔ یہ

حنفی المذہب بزرگ تھے۔ اور ایسے وقت میں جب کہ
میر مومن جیسے ذی علم اور صاحبِ اثر شخص دکن میں موجود
اور حکومت کے نقشِ ناطقہ بنے ہوئے تھے۔ یہ اپنے بزرگانہ
اطوار سے حیات بخشی بیگم کی مرشدی کا حق ادا کر رہے تھے
ان بزرگ کا اخلاص اور للّٰہیت ہی تھی جس نے
حیات بخشی بیگم کو ان کا معتقد بنا رکھا تھا۔ اس کا ثبوت
اس سے ملتا ہے کہ انھوں نے اپنی ذات کے لئے شاہی
خزانے سے کچھ نہیں چاہا اور بجائے حکومت کے عالم یا شیخ
بننے کی حکومت کو اپنا بنا لیا۔ حیات بخشی بیگم نے ان کے
لئے اپنے محل اور باغ سے متصل خانقاہ تعمیر کی خانقاہ کیا
اصل میں یہ شاہی مدرسہ تھا اور ایسا مدرسہ جس کو دکن کی یونیورسٹی

رکھنا چاہئیے۔ اس لئے کہ آخیر قطب شاہی دور تک تعلیمی مرکزیت

صرف اسی کو حاصل رہی۔

حضرت یوسف جمالؒ کی سوانح لکھنے کا یہ محل نہیں

لیکن چند وجوہ کی بنا پر تاریخیں جو اُن کے متعلق ساکت

ہیں اور ان کی شخصیت پردۂ خفا میں ہے۔ ضرورت

ہے کہ اس کو ظاہر کیا جائے تاکہ ہمارے علماء اور مشائخ دیکھیں

کہ ان کے پیشرؤں نے اپنے علم و تقدس سے ناموافق دور

میں بھی کتنے موافق کام کئے ہیں۔ حضرت یوسف جمالؒ

کا مزار گنبدوں کے احاطہ میں ٹھیک حیات بخشی بیگم کے

مقبرے کے سرہانے ہے۔ یاد رہے کہ بادشاہوں کے

مزار کے آگے کسی کا مزار بننے کا رواج نہیں ہے۔ یہ

حضرت یوسف جمال رح ہی ہیں جن کا یہ رتبہ ہے اور یہ حیات بخشی بیگم ہی ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں اپنے مرشد کے لئے گنبدوں جیسی جگہ میں مزار بنوایا اور پھر اپنے مزار کے لئے ایسی جگہ نشاندہی کردی جو مرشد کے پائینتی ہو۔

حضرت یوسف جمال رح اس مدرسہ اور خانقاہ کے روح رواں تھے اور سرپرستی کا شرف حیات بخشی بیگم کو حاصل تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں بھی اس "مدرسۂ حیات بخش" کو خاص امتیاز حاصل رہا طلبہ اساتذہ اور ملازمین وغیرہ کے لئے صیغۂ اوقاف سے تنخواہیں اور وظائف مقرر تھے۔ تاریخ نظامی کا مولف لکھتا ہے کہ اس مدرسہ کا ماہانہ خرچ دوسو ہون تھا۔ نگرانی ملابن خاتون میر جملہ کو تفویض تھی۔ مدرسہ میں ہر قسم کے طالب علم تھے جس میں غرباء

کی تعداد زیادہ تھی۔ نیز جملہ ہر ہفتہ یہاں آتے تھے اور طلبہ ا کی تعلیم کی بابت مدرسین کو ہدایات دیا کرتے تھے اور اس کی پابجائی کے لئے تاکید کرتے تھے۔

یہ خانقاہ اور مدرسہ تاناشاہ کے زمانہ تک جاری رہا۔ اس کے بعد بند ہو گیا۔ اب: افسوس کے متعلقہ اوقاف وغیرہ کا کہیں پتہ بھی نہیں۔

بہر حال اقامت خانہ کے اکیسوں پیں کمروں اور اوس کے دالان کی تعمیر ایسی مضبوط۔ ایسی خوبصورت اور اتنی بڑی وسعت کی ہے کہ راقم الحروف نے آج تک ہندوستان کے کسی مقام پر بھی اس نوعیت کی قدیم عمارت نہیں دیکھی۔ دہلی۔ لاہور، احمد آباد، گجرات، آگرہ، جونپور وغیرہ میں بے شک ایسی عمارتیں ہیں جو یادگار ہیں۔ اور اب بھی یہ اسلامی مدارس کا کام دیتی ہیں۔ مگر اس عمارت سے ان کا کوئی مقابلہ نہیں۔

مدرسہ کے باہر کی مغربی سمت میں جو گورستان ہے اس میں اکثر علماء، فضلاء، قراء، حفاظ اور بزرگ ہستیاں آسودہ ہیں! اس یہ ایک قسم کا خطہ صالحین بھی ہے۔

ہاتھی باؤلی

شاہی وقتوں میں جب کوئی بستی بسائی جاتی تھی یا قلعہ وغیرہ بنایا جاتا تھا تو سب سے پہلے پانی کا خیال کیا جاتا تھا کیونکہ یہ ضروریات زندگی میں سب سے اہم اور ضروری چیز ہے۔ پھر مدرسہ شاہی اور مسجد شاہی کے لئے فروگذاشت کیونکر ممکن تھی۔ اس کے لئے ایک عالیشان باؤلی تعمیر کی گئی تھی اور اسکے اوپر ایک عمارت بنی تھی جس پر کئی حوض تھے جسمیں ہاتھی کے ذریعہ پانی بھرا جاتا تھا اور پانی صاف ہو کر نلون کے ذریعہ سے مسجد کے حوض میں بھی پہونچتا تھا۔

مسجدِ شاہی حیات نگر

مدرسہ حیات بخش کا نقشہ آنکھوں کے سامنے رکھئے یعنی ایک وسیع مربع رقبے میں چاروں طرف خوبصورتی کے ساتھ دالان والے ایک سو چھپیں کمرے ہیں۔ جس کے جنوب و شمال اور مشرقی سمت میں عالیشان تین دروازے ہیں۔ دالان کے آگے چاروں طرف میدان ہے جس کو شاہی وقتوں میں تقاریب کے موقع پر دل بدل سے زینت دی جاتی ہو گی۔ اس میدان کے مغربی حصے میں مسجدِ شاہی حیات نگر ہے یہ ایک بلند کرسی پر واقع ہے۔ پوری مسجد پر پلاسٹر ہے۔ اور ساری عمارت سنگ بستہ ہے۔ اور تیجنہ کنبی نہایت خوبصورتی کیساتھ صاف کئے ہوئے ہیں

ایک مورخ کے لفظوں میں یہ ایک عالیشان مسجد ہے۔ اس کی وسعت
اور بلندی امتیازی شان رکھتی ہے جملہ قطب شاہی عمارتوں میں حسین کاری
کا شاہکار ہے۔ اس کی بلند کرسی اس کے حسن کو دوبالا کرتی ہے۔ یہ
شاندار بھی ہے اور عالیشان بھی۔ اس کو نازک صنعت کاری اور عمدہ
اختراعات سے سجایا گیا ہے۔ اس کے خوبصورت اور بلند مینار ایسے
دلکش نظارے کے حامل ہیں جو اپنے دیکھنے والوں کو متاثر کئے بغیر
نہیں رہتے۔ مسجد دور سے دکھائی دیتی ہے اور شاہراہ پر واقع
ہونے کی وجہ سے ہر چھوٹے بڑے کے پیش نظر ہو جایا کرتی ہے۔
جس کے احاطہ کی چار دیواری سے ملی ہوئی نلگنڈہ روڈ ہے جس
پر سے ہر روز ہزاروں لوگ گذرتے ہیں مگر ان میں سے چند
کو بھی نہیں معلوم ہوتا! اندر کیا ہے۔ اور اس جنگل میں کس طرح کا منگل

بچایا گیا ہے اگرچہ یہ مسجد قطب شاہی ہے۔ لیکن اپنی نفیس تعمیر کی
وجہ سے دوسری تمام عمارتوں میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے اور ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی تعمیر کاری کا نقش آخری ہے۔ جو فن
کے اعتبار سے عالم شباب میں وجود میں آئی ہے۔ چند سیڑھیوں
کے بعد مسجد کا پہلا صحن آتا ہے جس میں اب کوئی فرش نہیں ہے
لیکن ایک سنگین حوض ہے جس میں کبھی ہاتھی باؤلی سے پانی لایا
جاتا تھا اور فوارہ چھوٹتا تھا۔ اس کے بعد مسجد کے زینے
آجاتے ہیں اور اصل عمارت شروع ہو جاتی ہے۔ دائیں ہاتھ پر
(منارے متصل) ایک دروازہ ہے اوس کے اندر سیڑھیاں ہیں
جس سے مسجد کی چھت پر جاتے ہیں۔ وسیع چھت کے چاروں طرف
چھجے۔ کنگرے۔ منارے۔ جالیاں وغیرہ دیدہ افروز اور لطیف

اختراعات سے لبریز ہیں - قبلہ کی طرف چھوٹے منارے ہیں مجموعی حیثیت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جالیوں اور مناروں میں اندلس کے طرزِ تعمیر کا عکس آگیا ہے - یہاں سے دور دور کے دلفریب منظر بصیرت افروز ہیں - صحرا پہاڑ اور کھیتوں پر مالی وغیرہ کا ایک عجب پر لطف سماں پیش نظر ہوتا ہے چھت کے مغربی سمت کا حصہ امتیازی شان رکھتا ہے - الغرض یہ پچھلا حصہ بالخصوص عجیب اور نادر ہے چھت سے ہر دو منار پر جاسکتے ہیں - اس میں بھی سیڑھیاں اور غلام گردشیں ہیں -

مسجد کا اندرونی حصہ بھی خوب ہے - پانچ گنبدوں کو ضرورت کے ساتھ الگ الگ رنگ میں سجایا گیا ہے - خوبصورت اور سنگین ستون، چھت کی پائداری تنوع اور حسن کاری کی جلوہ ریزیوں

کو قائم رکھتے ۔ کے ذمہ دار ہیں ۔ مسجد کا فرش مضبوط مربع
و مستطیل پتھروں کا ہے اس کے بچھانے میں بھی عجیب و غریب اختراعات
اور غالبًا فنِ ریاضی کے قاعدے سے کام لیا گیا ہے ۔ مسجد کے
ہر دو عظیم الشان مناروں کے کیا کہنے ہیں ۔ ان کی بنیادوں کو سیسہ
پلا کر مضبوط کیا گیا ہے ۔ ان کے پتھروں کی تراش خراش، جماؤ
اور سجاوٹ اور صنّاعی قابلِ دید ہے ۔ ان کے اطراف کتاب
نما کمانیں ہیں ۔ ان کی بناوٹ اس طرح پر ہے کہ گویا عمارت سے
الگ بالکل معلق ہیں ۔ ان کمانوں کے اوپر میناروں کا درمیانی
حصہ ہے ۔ یہ ایک خوشنما گلدستہ ہے جس کی شکل ۔ ڈھلے ہوئے
سڈول صراحی یا مرتبان جیسی سمجھنی چاہئیے ۔ منارے کا بالائی حصہ
اَنَنّاس کے مشابہ ہے ۔ اس پر خوبصورت کلس ہے ۔ یہ اس جگہ ختم

ہو جاتا ہے اور چھت کے قریب سے اصل منار شروع ہوتے

ہیں۔ یوں تو مسجد کی پوری عمارت میں بہترین گچ استعمال کی گئی ہے

لیکن خاص کر مناروں میں اس کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ جس سے نازک

نقش و نگار اب تک تازہ نظر آتے ہیں۔ مینار کے چاروں طرف

ایسی صنعت کاری کی گئی ہے جس سے ہار کی شکل پیدا ہو گئی ہے اور

گویا وہ جواہرات کا ہار ہے۔ جو منار کے گلے میں ڈال دیا گیا ہے

جامعہ قرآنیہ حیات نگر

ادارۂ عالمگیر تحریک قرآن مجید کے پیشِ نظر قرآن مجید کی با معنیٰ تعلیم عام کرنا ہے۔ حصولِ مقصد کے لئے اس کے دو بڑے حصے کئے گئے ہیں۔

(۱) دنیا مختلف زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم پیش کرنا۔

(۲) مختلف زبانوں کے خادمِ قرآن پیدا کرنا۔

اوّل الذکر کے لئے کہ حسین ساگر حیدرآباد میں اپنی عمارت کے اندر دفتر قائم ہے۔ موخرالذکر کے لئے "جامعۂ قرآنیہ" کے نام سے ایک تعلیم گاہ .... میں خانقاہ حضرت یوسف جمال رح و مدرسۂ حیات بخش کی عمارت میں قائم ہوئی۔

رفیق کار ڈاکٹر محمد حمید اللہ، نواب میر اکبر علی خان اور مولوی
عبد المقیت خاں صاحب بی۔ سی۔ ایس سے مشورے ہوئے اور طے
پایا کہ وقتوں، مطالعات، مکروہات اور اخراجات کا خیال نہ کیا جائے
اور جامعۂ قرآنیہ کا قیام اسی عمارت میں کیا جائے تاکہ اس عمارت
کے بنانے والوں کا مقصد پورا ہو۔ اور اسی ذریعہ سے اس عمارت
اور اس مسجد کی آبادی اور مرمت بھی ہو سکے۔

اس علاقہ اور اس مسجد وغیرہ کا تعلق صرف خاص مبارک سے محکمہ متعلقہ
نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا۔ اور معزز حکام نے بھی کچھ نہ کچھ مدد
کی ہے۔ اور اب تک ادارے کے فنڈ سے تقریباً دس ہزار روپے
یہاں صرف ہو چکے ہیں۔ اب پانی کی عدم موجودگی باقی نہیں
رہی۔ ویرانگی دور ہو چکی۔ متعدد کمرے زمانہ حال کے مطابق درست

ہو چکے۔ مسجد میں بانگ وصلوٰۃ ہونے لگی۔ قرآن مجید کی صورت سرمدی سنائی دینے لگی۔ ادارہ نے اس کی آبادی اور تعلیمگاہ کے قیام وبقا کے لئے کچھ وقف بھی متعلق کر دیئے گئے ہیں۔ تاہم ابھی بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ اور کیا عجب ہے کہ جہاں دورِ عثمانی میں بہت کچھ ہو رہا ہے۔ تحریک قرآن پاک اور اس ضمن میں اس شاہی خانقاہ اور اس شاہی مسجد کے لئے بھی وہ سب کچھ ہو جائے جو اس کے شایانِ شان ہے۔ سب سے بڑی اور فوری ضرورت مرمت کی ہے اور خزانہ سے سالانہ ایک رقم مختص ہو جانے کی تاکہ آیندہ کے لئے بھی صدمہ کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔

ابو محمد مصلح